تیسری قسط

سندھی ادب کا مختصر جائزہ

شعری اصناف، اپنے تاریخی تناظر میں

2- نسب نامہ : سندھ میں لوگوں کے شجرے اور نسب، شعری انداز میں ڈھال کر ایک مخصوص انداز کی موسیقی کے ہمراہ گانے کا رواج بہت پرانا ہے۔ عربی میں اسے کبت اور فارسی میں نسب نامہ کہا جاتا ہے۔ غالباً نسب نامہ یا کبت کے زیر اثر ہی یہ صنف سندھی شاعری کا حصہ بنی ہے۔

3- ڈوہڑہ : ہندی میں بھی اس سے ملتی جلتی شعری صنف موجود ہے، جسے "دوھا" کہا جاتا ہے، تاہم اپنی ہئت، مضمون اور فنی لحاظ سے دوہڑہ اور دوھے میں فرق ہے۔ نیز دونوں اصناف میں عمر کے اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے۔ ہندی دوھے کا وجود امیر خسرو (وفات ۱۳۵۰ء) کے زمانے کا ہے جسے بعد میں بھگتی تحریک کے بانی رامانندہ (سرگواس ۱۴۷۰ء) نے اور کبیر بھگت (سرگواس ۱۵۱۸ء) نے جاری رکھا، لیکن سندھی دوہڑہ قدیم شغری صنف ہیت کا ہمعصر ہے جس کے مروج ہونے کی گواہی محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد کے وقت سے ملتی ہے جو کہ چھٹی اور ساتویں عیسوی میں ہوئی۔ (۱۵)

4- سورٹھے اور سٹھے یہ دونوں اصناف سندھ کی قدیم شعری اصناف میں شمار ہوتی ہیں اور ان کا حسب نسب بھی وہی ہے جو دوہڑہ اور بیت کا ہے۔ البتہ ہر ایک فنی ہئت اور ساخت میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ جہاں تک اظہار کا تعلق ہے تو یہ سب کی سب گائی جانے

والی اصناف ہیں اور اگر پیمانے کی بات کی جائے تو ان میں سے ہر صنف چھندرچنا کے معروف اصولوں پر ترتیب دی جانے والی ہے۔(۱۶)

5- رزم نامہ یا راسو (Epic Poetry) اس قسم کی شاعری "بسیل راسو" کے روپ میں ملتی ہے جس کا پس منظر محمود غزنوی (۱۰۰۱ء) کی اجمیر کے راجہ "بسیل" کے ساتھ جنگ ہے۔ مذکورہ رزمنامہ اس وقت کے معروف شاعر ترپتی نلہ نے تخلیق کیا تھا۔ راسو یا رزمنامے کا دوسرا حوالہ اس وقت ملتا ہے، جس دفتر شہاب الدین غوری کا راجپوت، راجوں، مہاراجوں اور اجمیر کے راجہ پرتھوی سے مقابلہ ہوا۔ اس پرتھوی راج راسو کا تخلیق کار اپنے عہد کا مشہور شاعر چند بردہ تھا۔

سندھ میں سمنگ چارن (۹۵۰ء تا ۱۰۲۵ء) کا شمار بھی بلند پایہ تخلیقی شعراء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے راسو نہیں تخلیق کی البتہ رزمیہ شاعری کو خوب جلا بخشی اور مشہور کیا۔ (۱۷) انھی کی کوششوں سے سندھی رجزیہ شاعری کی تاریخ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں رقم ہونا شروع ہوئی۔

بھاگو بھان بھی شاعر تھا اور ان کی شہرت کا سبب بھی رزمیہ شاعری ہے۔ انھوں نے سندھ کے دودو چنیسر کے تاریخی قصے کو منظوم کیا ہے۔ رزمیہ شاعری کا تقاضا ہے کہ اس میں بلند پروازی خیال جوش، جذبہ اور حقائق کو اس انداز سے سمویا جائے کہ شعر، حالات و واقعات کا آئینہ دار نظر آنے لگے۔ انھوں نے یہ تمام خوبیاں اپنی رزمیہ شاعری میں شامل کر کے رزمیہ شاعر ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔

سومرا اور سمہ دور

"دودو چنیسر" کا تاریخی واقعہ اگرچہ ۱۰۵۰ء تا ۱۳۵۰ء کے عہد سے تعلق رکھتا

ہے، لیکن اس کی تاریخ سومرا دور سے وابستہ ہے اور ابن سومار کی اولاد سومرو کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کے دور حکومت کا اپنے خاندان کے سربراہ امیر ساہوؒ کے نویں صدی عیسوی (۲۲۱ھ) میں قبائلی سردار بنتے ہی آغاز ہوگیا تھا۔ اس وقت امیر ساہو کی حکومت محض مالوہ، گجرات، بیکانیر، ڈھٹ اور لڈانو تک محدود تھی، لیکن بعد ازاں جب محمود غزنوی کا فرمانروا سلطان عبدالرشید (۱۰۵۱ء تا ۱۰۵۳ء) سندھ کا انتظام نہ چلاسکا تو سومرا خاندان کے ایک فرد رائے ہمیر (وفات ۱۰۵۵ء) نے سندھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ (۱۸) سومرا سندھ کی دونوں ریاستوں منصورہ اور ملتان کے حکمران تھے اور رائے لقب رکھتے تھے۔(۱۹)

بھونگر رائے اس سومرا خاندان کا ایک فرد اور سندھ کا حاکم تھا۔ اس کے بیٹے نے دو شادیاں کی تھیں۔ ایک اپنوں میں دوسری غیر قبیلے کی ایک لڑکی سے۔ غیر قبیلے کی اس خاتون سے باگھی نامی لڑکی اور چنیسر نامی لڑکا ہوا۔ دوسری بیوی سے بیٹا اس وقت پیدا ہوا جب وہ خود اس دنیا میں نہیں تھا، اس بچے کا نام بھی عربی روایت کی پیروی کرتے ہوئے ''دودو'' رکھا گیا۔

بھونگر رائے کی وفات کے بعد باگھی وراثت سے اپنے بھائیوں کے حق میں دستبردار ہوئی۔ چنیسر چونکہ بڑا تھا، اس لیے سماجی روایات کے مطابق اقتدار کا وارث اسی نے بننا تھا۔ دودو نے سندھ کے سرداروں کو خط لکھے۔ باگھو بھان کے مطابق

''دودل رائے نے چاروں اور ناے بھیجے،
کچھ ناے کچھ، بجھ اور کاچھ کی سمت بھیجے،
کچھ ماتھیلے سے پرے

کچھ جیسلمیر کی اور، کچھ باھڑمیر سے آئے،
پھر آگئے لوگ اجمیر کے
اور جمع ہوئے جاڑیجوں کے جتھے بھی،
چنہ قبیلہ شامل ہوا اور بھٹی بھی شریک تھے،
راجڑ آئے، سمہ اور سومرا بھی شامل ہوئے۔"

غرضیکہ سلطنت سندھ کے تمام صوبوں اور قبیلوں کا نمائندہ اجلاس شروع ہوا تاکہ حکومت کس قبیلے کے پاس رہے۔ اکثر قبائلی سردار اور ممبران "دودا" کی ذہانت، شجاعت، جذبہ وطن پرستی اور عدل و انصاف پسندی کے پیش نظر اسے حاکم بنانے کے حامی تھے۔

اس طرح سردار جمع ہوئے۔ چند، سماجی روایات کے پیش نظر چنیسر کے حق میں تھے اور کچھ اس لیے دودو رائے کو وارث بنانے پر اصرار کررہے تھے کہ چنیسر کے ننھیال کا تعلق سندھ کے جس قبیلے سے ہے، حکومت سندھ کا آئندہ تسلسل، اس خاندان سے وابستہ ہوجائے گا۔ آخرالذکر رائے کی تائید بڑھتی دیکھ کر چنیسر نے سوچا کہ "بڑا میں ہوں اور حاکم دودو بنے۔ یہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ تو ہورہا ہے۔ چلو ہونے دو۔ میں کہیں نکل جاتا ہوں۔ یہاں رہوں گا تو میری ناراضگی سب سرداروں پر عیاں ہوجائے گی....." اور چنیسر، شکار کا بہانہ بناکر شہر سے نکل جاتا ہے۔

جب دودو کو معلوم ہوتا ہے تو سوچتا ہے کہ بڑے بھائی کی موجودگی میں، تاج اپنے سر نہیں رکھنا چاہیے۔ فیصلہ یہ کرنا ہے کہ اگر زعماء و رؤسا اور سردار مل کر اس کے سر پر تاج رکھنا چاہتے ہیں تو یہ اچھا نہیں ہوگا، بلکہ بات یہ اچھی رہے گی کہ "میں خود تاج

اپنے سر سے اتار کر بڑے بھائی کے سر پر رکھوں گا۔" اٹھ کر خط لکھ کر نامہ بر کے حوالے کرتا ہے اور جلد سے جلد چنیسر کو ساتھ لے کر آنے کی تاکید کرتا ہے۔ پیغام / خط ملتے ہی چنیسر آجاتا ہے۔ وہ گھوڑی پر سوار ہے۔ محفل سے اٹھ کر دودو استقبال کرتا ہے اور اسے ساتھ لے کر دربار میں لاکر مخصوص مسند پر بٹھاکر تاج لے آنے کے لیے کہتا ہے۔ جب تک تاج آئے، چنیسر بھی سوچ میں پڑجاتا ہے اور فیصلہ نہیں کرپاتا کہ اقتدار قبول کرے یا نہ کرے۔ اٹھ کر، عین وقت پر باہر چلا جاتا ہے اور سر پر رکھا ہوا تاج اتار کر رکھتے ہوئے تھوڑی دیر رکنے کو کہتا ہے۔

اس کے باہر چلے جانے پر چہ میگوئیاں شروع ہوجاتی ہیں اور ایک بار پھر دربار کی طرف سے، دودو پر اس بات کا دباؤ بڑھ جاتا ہے کہ اقتدار دودو ہی قبول کرلے۔ چنانچہ دربار کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے، تاج دودو کے سر پر رکھا گیا۔ اپنے خلاف ہونے والے فیصلے نے چنیسر کو طیش دلایا اور وہ بغاوت پر اتر آیا۔ انتقام کا سوچ کر دلی کے حاکم علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) سے، تخت لے کر دینے کے عوض خلجی کو اپنا رشتہ دار بنانے کا معاہدہ کرتا ہے۔ مذکورہ معاہدے کی تکمیل کی خاطر افغانیوں کا لشکر ساتھ لے آتا ہے اور سندھ پر حملہ آور ہوتا ہے۔

جنگ کے نتیجے میں بقول بھاگو بھان "علاؤ الدین کے ایک سالار شیدی کے کئی ہزار فوجیوں میں سے صرف چھ سپاہی باقی بچے، جبکہ سومرا حکمرانوں کی طرف سے چنیسر کے بیٹے ننگر کے زیر فرمان جو لشکر تھا، اس سے صرف نو سپاہی باقی بچے ہیں۔"

آٹھ روز بعد شہزادہ ننگر کے پاس مزید تازہ دم لشکر پہنچ گیا اور خلجیوں کی طرف سے بھی ہنبس خان پٹھان کے زیر حکم نئی کمک، لڑائی کے میدان پر پہنچ گئی۔

ہنس خان "ویراواہ" کے مقام پر ہونے والی اس جنگ میں مارا جاتا ہے جو کہ نامدار بیگ کے بھانجے ہیں، ان کے مارے جانے پر نامدار بیگ کو سخت دکھ پہنچتا ہے اور انتقام کے لیے آگے بڑھ کر لشکر کا سالار بنتا ہے۔ جنگ شروع ہوتی ہے اور نتیجے میں ایک طرف دودو کا بیٹا "منگر" مارا جاتا ہے اور سومرا کے حامی لشکر کو بہت بڑا جانی نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو دوسری طرف نامدار بیگ کے لشکر کا بھی کوئی اکاد کا سپاہی دکھائی دیتا ہے۔ اس صورت حال نے نامدار بیگ کو ننگر سے بات کرنے پر مجبور کیا اور بھاگو بھان نے درج ذیل گفتگو سنی:

نامدار بیگ : "ننگر! واسطہ ہے تمہیں اللہ کا، مجھے بچالے۔ سارے جوان مارے گئے ہیں اور باقی میں تمہارے والد (چنیسر) کا دوست بچ گیا ہوں۔ اس لحاظ سے میں تمہارا چچا ہوں، مجھے بچالے۔"

ننگر : "یہ رشتہ اب تمہیں یاد آیا ہے، پہلے کیوں نہ یاد آیا جب بے تحاشا لوگ مارے جارہے تھے، جب میرے بھائی منگر پر حملہ ہورہا تھا اس وقت بھی تمہیں یہ رشتہ یاد نہ آیا۔ اب میں کیسے تمہیں بچاؤں گا۔ موت تمہارا مقدر ہے۔" مایوس ہوکر نامدار نے ایک نئی چال چلی اور ننگر کو مخاطب ہوکر کہا:

نامدار : "ننگر تمہارا پورا جسم سخت گھائل ہے۔ تمہارے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ مجھے مارنے کے بعد بھی تم زندہ تو نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اللہ کی راہ میں اپنے سر کا صدقہ دے دو۔"

ننگر : بیشک اللہ ہی قادر ہے اور میرے اس جسم، حیات اور ممات کا مالک بھی وہی اللہ ہے۔ اسی کے نام پر سر مانگتے ہو۔ مجھے انکار نہیں۔ لو یہ میری کٹار اور خود ہی میرا سر قلم

کرلو۔" ننگر کا سب سے بڑا دشمن نامدار بیگ بھی تسلیم کرتا ہے کہ "ننگر کو میں نے شہید نہیں کیا بلکہ انھوں نے اللہ کے نام پر خود ہی اپنا سر قربان کیا۔ انھوں نے راہ مولا میں مجھے فی سبیل اللہ اپنا سر دے دیا ہے۔"

قصے کا یہی منفرد انداز بیان جہاں قاری اور سامع کو اپنی طرف متوجہ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہاں انھیں بھاگو بھان کے طرز بیان اور انداز ترتیب داستان پر بھی داد دینی پڑتی ہے۔ قصہ سن کر یا پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ بھاگو نہ صرف مذکورہ جنگ کا عینی گو ۔ تھا، بلکہ دونوں بھائیوں کو صلح و صفائی سے مسئلے کا حل نکالنے پر آمادہ کرنے کا بار گراں بھی برداشت کرتا رہا، لیکن اس کی یہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں اور جنگ اٹل ہوگئی۔

جب جنگ ہورہی تھی تو اس میں سندھ کے کسی قبیلے نے دودو یا چنیسر کی کتنی حمایت کی اور کس خاندان نے کس کے حق میں کیا کیا قربانیاں دیں، جہاں یہ سب باتیں بڑی تفصیل سے بیان کرتے وقت بھاگو نے رزم گوئی کا باکمال انداز اختیار کیا ہے، وہاں روایتی داستان گوئی اور اعلیٰ فن کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ نیز بھاگو کو یہ فن رزمیہ گوئی اتنا جامع، پختہ، منظر نگاری کا شاہکار اور واقعات و حقائق کا عکاس ہے، کہ اسے سندھی ادب میں رزمیہ شاعری کی لازوال مثال مانا جاتا ہے۔ یہ بھی بھاگو بھان کے انداز کا ہی کمال ہے کہ جب ننگر کے بعد دودو خود بھی شہید ہوجاتا ہے تو دودو کی شہادت پر بھاگو بھان بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ :

اُبھ سبھ کھال اُبھو، اُبھ نہ اُبھو کوئی
موئے بہ متھے تھیو، سورھ سر سندوئی

ترجمہ : آسمان سب کی نظر میں اونچا ہے اور آسمان سے زیادہ بلند کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن سنو لوگو! شہید کا رتبہ سب سے اونچا ہوتا ہے۔ ادھر دیکھو، اس شہید وطن کا رتبہ کتنی بلندی پر لکھا گیا ہے۔

سندھی رزمیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوا کہ سومرا دور حکومت میں مذکورہ جنگ کے علاوہ سومرا اور گجروں، سومرا اور، توماروں، سومرا اور جام ہالے کے درمیان بھی جنگیں ہوئی تھیں، لیکن ان تمام جنگوں کا اثر محض تاریخ، سیاست اور معیشت پر ہوا، سندھ کے سرحدوں اور سندھ کے معاشری پر اتنا گہرا اثر نہیں ہوا جتنا خلجیوں کے جنگ جیت جانے کے بعد مجموعی طور پر سندھ پر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ "دودو چنیسر" کا یہ واقعہ نہ صرف تاریخ بلکہ ادب میں بھی بنیادی اور اہم حیثیت حاصل کر گیا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سومرا دور میں کئی عشقیہ داستانیں بھی پروان چڑھی تھیں۔ اگرچہ ان داستانوں میں قصہ "سئی پنھوں" نمایاں، منفرد اور مؤثر ترین ہونے کی وجہ سے پاکستان اور بیرون پاکستان بہت مقبول و مشہور، سندھی ادب میں بنیادی حیثیت کا حامل اور عشقیہ داستانوں میں سرفہرست ہے لیکن سندھ کی قدیم تاریخوں کے مطابق قصہ سئی پنھوں کا زمانہ سومرا عہد سے پہلے کا ہے۔ (۲۰)

ا۔ اس قصے کی رو سے سسی کا کردار بہت مشکل، نمایاں، مثالی اور اہم ہے۔ سئی چند دنوں کی تھی کہ اس کے والدین نے اسے صندوق میں ڈال کر دریائے سندھ میں بہادیا تھا۔ ماضی میں کراچی کے نزدیک سندھ کا ایک اہم تجارتی شہر ممھور، دریائے سندھ کے کنارے پر آباد تھا۔ محمد دھوبی کا اسی دریا پر دھوبی گھاٹ تھا۔ کپڑے دھوتے ہوئے بے اولاد محمد دھوبی کو سئی، دریائے سندھ میں بہتی ہوئی ملی۔ کھیل کود میں مصروف رہتے ہوئے سئی

جب جوانی کو پہنچی تو اس کے حسن کی خوشبو سندھ سے باہر کی فضا میں پھیل جاتی ہے۔ بلوچستان کے علاقے کیچ مکران کا ہوت شہزادہ پنھوں جب تجارتی قافلوں کے ذریعے سئی کی صورت و سیرت کی باتیں سنتا ہے، تو اپنے ملک میں حاصل عیش و عشرت چھوڑ کر سمھور میں آکر محمد دھوتی کے پاس دھوتی بن جاتا ہے۔ بعد میں محمد، سئی کا رشتہ پنھوں سے کر دیتا ہے۔ عین شادی کے دن کیچ مکران کے حاکم کے کہنے پر پنھوں کے بھائی پنھوں کو لینے کے لیے آجاتے ہیں۔ سئی اور پنھوں کو نشہ پلاکر، سئی کو سوتا ہوا چھوڑ کر پنھوں کو اونٹ پر اٹھا کر چلے جاتے ہیں۔

بیدار ہونے پر سئی، پنھوں کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ دوسری طرف، پنھوں کو بھی جب ہوش آتا ہے تو اپنے آپ کو آزاد کراکر واپس پاپیادہ سفر شروع کرتا ہے۔ آخرکار سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر پہنچ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ سئی کی وفات ہوچکی ہے۔ قبر پر پہنچتے ہی وہ خود بھی وفات پاجاتا ہے۔ المختصر قصہ سئی پنھوں مقصد کی بار آوری کے لیے جہد مسلسل کی ایک ایسی مثال ہے کہ اس کی نظیر شاید ہی دنیا میں کہیں ملے۔

ii- دوسرا قصہ "سوہنی مہار" کا ہے۔ اس قصے کے مطابق سوہنی کی شادی ایک ایسے شخص سے کرادی جاتی ہے جسے وہ ناپسند کرتی ہے۔ وہ مہار (بھی وال) کو پسند کرتی ہے جو اصل میں کسی ملک کا شہزادہ ہوتا ہے، لیکن سوہنی کے قریب رہنے کی خاطر بھیوال بن جاتا ہے۔ سوہنی کی شادی ہوجانے کے بعد بھیوال، دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر جنگل میں جھگی بناکر رہنے لگتا ہے۔ سوہنی روزانہ رات کو گھڑے پر تیر کر دریا پار مہار سے ملنے چلی جاتی ہے۔

جب سوہنی کی نند کو اس بات کا علم ہوجاتا ہے تو کچے گھڑے پر ایسا رنگ کرتی

ہے کہ وہ بھی پکا گھڑا معلوم ہوتا ہے۔ جب اندھیری رات کو سوہنی گھڑا لے کر دریا پار کرنا چاہتی ہے تو دریا میں گھڑا گھلنے کی وجہ سے سوہنی ڈوبنے لگتی ہے۔ اس وقت مہار کو پکارتی ہے۔ اندھیری رات، بارش اور دل ہلا دینے والا وحشت ناک دریا دیکھ کر کوئی کشتی بان مہار کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ مہار خود ہی ہمت کر کے دریا میں کود پڑتا ہی اور جب سوہنی کو بچانے کے لیے بانھوں میں لے لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی دونوں کو دریا اپنی بانھوں میں لے لیتا ہے۔

iii- قصہ لیلاں چنیسر بھی سومرا دور سے وابستہ ہے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۲۴ء میں سندھ کے حاکم کا نام سنان الدین چنیسر تھا۔ نام چنیسر، سومرا خاندان میں خاصا مقبول و مشہور رہا ہے۔ اس لحاظ سے محققین نے اس قصے کے ہیرو چنیسر رائے کو بھی سومرا گردانا اور داستان کا تعلق سومرا دور سے جاکر جوڑا ہے۔ (۲۱) کہانی میں ہیروئن (Heroine) لیلاں کی، ملک کے حاکم چنیسر سے شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں میاں بیوی میں بے مثال پیار ہے، لیکن کم عقلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور لالچی ذہن کی تسکین کی خاطر، قیمتی پتھروں کے ہار کے عوض اپنے خاوند چنیسر کا، ایک رات کے لیے ایک عورت "کوں رو" کو نمرو کے ہاتھ سودا کر دیتی ہے۔ اس ناقابل معافی اور ناقابل تلافی جرم پر جب چنیسر اسے طلاق دے دیتا ہے تب اسے اپنی سب سے بڑی بھول کا احساس ہوتا ہے۔ اب جاکر اسے محسوس ہوا کہ لالچ میں آکر اس نے کتنی بڑی نادانی کی تھی۔

اپنی یہ غلطی اور خطا معاف کرانے کے لیے چنیسر کے پیارے وزیر جھجھرو کی مدد لیتی ہے، لیکن طلاق کے شرعی مسئلے کی موجودگی اور شدید غم، غصے اور ناراضگی کے باعث، چنیسر بات سنتا ہی نہیں۔ کافی دنوں کی منت سماجت، آہ و زاری، آزی و نیازی کے بعد اور

جھرو کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے دونوں میاں بیوی کی کسی محفل میں اجنبیوں کی طرح ملاقات ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو پہچانتے ہی دونوں کو موت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

۱۷- اسی طرح عمر ماروی کا قصہ بھی مذکورہ بالا رومانوی کہانیوں کا ہم عصر ہے۔ عمر امر کوٹ (تھر) کا بادشاہ تھر کے علاقے ملیر کی حسین و جمیل دوشیزہ ماروی کے حسن کی تعریف سن کر اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مارو قبیلے کی مجسمہ حسن، ماروی کو کنویں سے پانی بھرتے ہوئے اٹھا کر "امر کوٹ" لے آتا ہے۔ "امر کوٹ" میں قید رکھنے کے بعد ماروی سے شادی کی درخواست کرتا ہے، لیکن ماروی انکار کرتی ہے۔ اس کے انکار کو اقرار میں تبدیل کرانے کے لیے اسے اذیتیں دی جاتی ہیں اور اس پر ہر قسم کا تشدد کیا جاتا ہے۔ جب پھر بھی نہیں مانتی، تو اسے طرح طرح کا لالچ دیا جاتا ہے۔ اس پر بھی جب راضی نہیں ہوتی تو تجربے کار، چرب زبان اور چالاک عمر رسیدہ عورتوں کی خدمات لی جاتی ہیں تاکہ وہ ماروی کو شادی پر رضامند کر سکیں، لیکن ان کی ذہانت اور شاطر پن بھی ماروی کے دل سے اپنے وطن ملیر اور ہموطن ماروں کی محبت نہ نکال سکا۔ مجبوراً عمر، ماروی کو نہ صرف امر کوٹ (☆) سے آزاد کرتا ہے، بلکہ خود ہی اسے اپنی بہن بنا کر باحفاظت عزت و احترام ملیر چھوڑ آتا ہے۔(☆☆)

۱۸- عمر بھی سومرا تھا جس کی یہ کہانی ہے، اس میں ماروی حب الوطنی کی عظیم مثال

(☆) اب اسے عمر کوٹ کے نام سے شہرت حاصل ہے، لیکن اس کی تعمیر امر سومرا نے کرائی تھی۔ سندھ جا سورما، جی ایم سید۔

(☆☆) یہ کراچی کا ملیر نہیں بلکہ "تھر" کے ایک علاقے کا نام ہے۔

پیش کرتی ہے اور ہمیر بھی سومرا حاکم تھا، جس پچے سالے اور وزیر رانو کی نسبت سے مومل رانو کے عنوان سے عشق و محبت کی بے مثال کہانی مشہور ہے۔ اس کہانی کا ایک طرف سندھ میں میرپور ماتھیلو کے مقام سے گزرنے والی کاک ندی کی مناسبت سے کاک محل میں مقیم مومل کا ذکر ہے تو دوسری طرف تھر کے علاقے میں ڈھٹ اور لڈانو کے علاقے کے حاکم ہمیر سومرے کا رانو نامی وزیر سے منسوب کہانی ہے۔

اگر ڈھٹ اور لڈانو کا وزیر رانو ذہانت، ہوشیاری اور مردانہ حسن کا مجسمہ تھا تو مومل بھی بہت ذہین تھی اور اپنے عہد میں بے مثال حسن و جمال کا پیکر سمجھی جاتی تھی۔ یہ دونوں ذہانت، دانشمندی اور حاضر دماغی کی کئی آزمائشوں اور لا تعداد امتحانوں میں کامیاب ہونے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور عشق و محبت میں مبتلا ہو کر شادی کر لیتے ہیں۔

رانو، ملکی کاروبار سے فراغت ملتے ہی سر شام ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار ہو کر لڈانو سے مرپور ماتھیلو آجاتا ہے، جہاں دونوں میاں بیوی باتیں کرتے رات گزار دیتے۔ جبکہ رانو صبح سویرے لڈانو پہنچ کر کاروبار میں مصروف ہو جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد رانو کے گھر والی اور ہمیر کی بہن، اپنے میاں کی خاطر حاضری کی بات اپنے بھائی ہمیر سے کرتی ہے جس پر ہمیر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اونٹ ہی مروا دیتا ہے جس پر رانو، لڈانو سے ماتھیلو کے مقام کاک محل تک راتوں رات پہنچ جاتا تھا۔ اونٹ مر جانے کے بعد رانو ایک اور اونٹ حاصل کر لیتا ہے اور کچھ عرصے کے ناغے کے بعد پھر سے لڈانو اور کاک محل کے درمیان آجانے کی مشق جاری رکھتا ہے۔

اچانک ایک دن رانو جب معمول سے کافی دیر سے کاک محل پہنچتا ہے تو ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنی آمد کی کوئی نشانی گھر میں چھوڑ کر واپس لڈانو چلا جاتا ہے۔ صبح کو اٹھ

کر مومل کو رانو کی آمد کا پتہ چلتا ہے اور یقین ہو جاتا ہے کہ رانو ناراض ہو کر واپس چلا گیا ہے۔ اپنی بہن سومل سے مشورہ کر کے دونوں، کاک محل چھوڑ کر لدانو کا سفر کرتی ہیں۔ لدانو پہنچ کر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ رانو ناراض ہے۔ چنانچہ سومل کی ذہانت اور ہوشمندی کے باعث مومل، اور رانو کی ملاقات کرائی جاتی ہے۔ جہاں مومل اپنی صفائی پیش کر کے ناکردہ خطا کی معافی طلب کرتی ہے۔ معافی کے لیے سندھ کے اس روایتی حلف کی شرط رکھی جاتی ہے، جس کے مطابق، بے قصور یا قصوروار ہونے کا بالے الاؤ سے گزر کر یقین دلایا جاتا ہے۔ چنانچہ مومل یہ شرط منظور کرتی ہے۔ تاریخ مقرر ہوتی ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں اور مومل بے خوف و خطر اللہ کا نام لے کر الاؤ میں کود جاتی ہے۔ عین وقت پر رانو بھی اسی الاؤ میں کود جاتا ہے اور دونوں موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

vi- سورٹھ، رائے ڈیاچ اور راجا کھنگھار یہ تین فریق اس کہانی کے اہم کردار ہیں جبکہ کہانی میں بجل بھی ایک ایسے کردار کے طور پر شامل ہے جو اپنے سازسارندہ سے پرسوز اور دلنواز دھنوں کی مدد سے انسانوں یا چرند پرند کو موہ لینے کا گر خوب جانتا ہے۔ وہ اس کہانی میں اس طرح پیش ہوتا ہے کہ کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ سورٹھ نئی بیاہتا دلہن، جسے اپنے شوہر راجا ڈیاچ سے اس لیے بھی بے پناہ پیار ہے کہ وہ مجموعی طور پر انسان ذات کا غمخوار اور غمگسار ہونے کے علاوہ، غریبوں کا مددگار اور سخاوت کا دھنی ہے۔ انھی خوبیوں کی بنا پر اس کی ریاست میں مانگنے والا نہیں ملتا تھا اور خوشحالی ہر جگہ نظر آتی تھی۔ ملکی خوشحالی، رعایا کی آسودگی اور رعایا کا اپنے راجا پر بھروسہ دیکھ کر، پڑوسی ریاست کا راجہ کھنگھار راجہ ڈیاچ سے جلنے لگا تھا اور جنگ کے بہانے تلاش کرتا رہتا تھا لیکن ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ اچانک اس کا بجل جیسے پرسوز اور مؤثر ترین گانے والے کی طرف دھیان چلا جاتا ہے

اور انعام اکرام کی نوازشیں کرنے کا وعدہ کرکے بجل کو رائے ڈیاچ سخی کا سر قلم کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔

بجل رائے ڈیاچ کے سر کا سوالی بن کر ڈیاچ کے محل تک پہنچ جاتا ہے۔ رعایا اور سورٹھ سمیت ہر شخص اس گانے والے منگتے بجل کی منت سماجت کرکے اسے سر کی صدا سے باز رہنے کے عوض موٹھ مانگادان دینے کا وعدہ کرتا ہے، لیکن اس کی رٹ یہی ہے کہ "وہ سخی کے دروازے سے خالی ہاتھ ہرگز واپس نہیں جائے گا۔"

سخاوت کا یہ بہت بڑا امتحان تھا، جس میں رائے ڈیاچ سرخرو ہونے کے لیے بے قرار و بے تاب ہے۔ ایک رات رائے ڈیاچ محافظوں سے آنکھ بچاکر خود وسائل کے پاس چلاجاتا ہے اور کھڑکی کے ذریعے اسے اپنے کمرے میں لے آتا ہے جہاں قاتل کو اپنا خنجر دے کر اپنا سر مقتل پر رکھ دیتا ہے۔ بجل سخی کا سر تن سے الگ کرکے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور جاکر رائے کھنگار کو پیش کرتا ہے۔ لیکن مراعات کی بجائے راجا کھنگار بجل کی بھی سر قلم کروادیتا ہے۔

vii- "مورڑو اور مگر مچھ" کے عنوان والا مشہور قصہ تو ہے ہی سومرا دور کا۔ اس قصے کی رو سے "مور" نامی اپاہج میر بحر اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا، جسمانی طور پر معذور اور بہت ہی ضعیف شخص تھا۔ ساحل سمندر پر کلاچی (اب کراچی) نامی گاؤں میں یہ خاندان ماہی گیری میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اچانک کہیں گہرے سمندر سے کوئی مگر مچھ آیا اور عین اس مقام پر انسانی شکار کھیلنے لگا جس جگہ "مور" کے بھائیوں کی کشتیاں کھلے سمندر میں جاتی تھیں۔ ایک دن مور کے ایک بھائی پر یہ خونخوار مگر مچھ حملہ آور ہوا اور اسے نگل گیا۔ اس طرح پانچوں بھائی اس کے نوالے بنتے گئے۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ مورڑو کے بوڑھے ماں

باپ جوان بیٹوں کی جدائی کا صدمہ سہار نہ سکے اور فوت ہوگئے۔ اب مورڑو نے ہمت کی۔ ایک ایسا آہنی پنجرہ بنوایا، جس کے مضبوط اور تیز دھار والے ہک (Hook) باہر کی طرف لگے تھے۔ "مور" اس پنجرے میں بیٹھ گیا اور فولادی رسی کا ایک سرا اس سے جوڑ کر دوسرا سرا ساحل پر کھڑے بھینسوں کی فولادی پنجالی سے باندھ لیا۔ جب اس کا پنجرا سمندر میں عین مگر مچھ کے رہنے کی جگہ پر اتار دیا گیا اور معمول کے مطابق مگر مچھ نے اسے ہڑپ کرنا چاہا اور ہک اس کے جسم میں پیوستہ ہوگئے، تو بھینسوں کے پوچھل سے بندھی کپاس کو آگ لگادی گئی۔ بھینسوں نے پوری طاقت لگاکر مگر مچھ کو ریت پر کھینچ لیا۔ جس کا پیٹ چاک کرکے انسانی ڈھانچے باہر نکال لیے گئے، جنھیں کراچیں میں اس جگہ دفن کیا گیا ہے جہاں کچھ عرصہ قبل مورڑو کی یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ اس مگر مچھ کا ڈھانچہ کراچی میں مچھلی عجائب گھر میں موجود ہے۔

ایسے تاریخی ثبوت موجود ہیں کہ مذکورہ فولادی پنجرہ سومرا حاکم دلورائے نے مورڑو کے لیے بنواکر بھیجا تھا۔ دلورائے ان دنوں پنجاب کے بعض علاقوں سمیت سندھ کے بالائی حصہ کا حکمران تھا جس کا پایۂ تخت اروڑ (روہڑی سندھ) تھا۔

مزید کچھ رومانوی داستانیں بھی اس عہد سے وابستہ ہیں لیکن درج ذیل کہانیاں اس لیے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں کہ ان کے حوالے سے سندھی ادب کو بعض منظوم گاتھائیں ملی ہیں۔

viii- سیف الملوک اور بدیع الجمال کے عنوان والی اس کہانی میں بیان کیے گئے مقامات مثلاً ضلع بدین میں جو خشک جھیل سیف الملوک سے منسوب ہے وہ موجود ہے۔ یہیں اسی ضلعے میں "سیف الملوک کی جی واء" (کنواں) تو ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے خود جاکر دیکھا تھا۔

اس کنویں کا بھی کہانی میں ذکر ملتا ہے اور باکڑہ دریا کا حوالہ بھی موجود ہے۔ جس کا اروڑ سے رخ تبدیل کیا گیا تھا، تو ان علامات، نشانیوں اور حوالوں کو آپس میں جوڑ کر محققین نے ثابت کیا ہے کہ نہ صرف مذکورہ کہانی کا تعلق سندھ سے تھا بلکہ زمانہ بھی سومرا تاریخ کا بنتا ہے۔

-ix سندھ میں دوسرا قصہ مل محمود ائیں مہر نگار کے عنوان سے مشہور و مقبول ہے۔ اس کا پس منظر تو ہے ہی نیرون کوٹ (حیدرآباد سندھ) اور شاہ مکی عرف چھٹل شاہ سے جس کی قبر آج بھی یہاں موجود ہے۔ اس کا زمانہ بھی سومرا تاریخ میں ٹھیک بیٹھتا ہے۔

-x ڈمن سنارے کی داستان بھی سندھ کی رومانوی داستانوں میں موجود ہے اور زیر تذکرہ سومرا دور سے تعلق رکھتی ہے۔

-xi ایک اور قصہ "عمرائیں گنگا" کے عنوان سے سندھی ادبی تاریخ نے بعد میں دریافت کیا ہے جس کی نشاندہی مشہور و معروف مؤرخ نے تاریخ طاہری میں کی ہے۔ علاوہ ازیں

-xii "خدا دوست اور محمود غزنوی" کے سفرنامے سے بھی ایک قصہ، کچھ عرصہ قبل سندھی ادبی تاریخ کا حصہ بنا ہے، جس میں موجود حوالوں کا تعلق سومرا دور سے جوڑنے کے لیے کافی ہیں۔ ان سب قصوں، داستانوں اور کہانیوں کی فطرت و مزاج نیم تاریخی اور بنت، عشقیہ داستانوں کی ہے جبکہ انھیں تفریح طبع کے پیش نظر ترتیب دیا گیا ہے اور ان کے اندر "گاتھائیں" اس انداز سے پیوستہ ہیں جیسے انہی کے حصہ ہوں۔ غالباً انہی گاتھاوں کی وجہ سے یہ قصے ادبی تاریخوں تک پہنچے ہیں۔

سومرا دور حکومت میں تصنیف و تالیف کے شعبوں میں بھی سندھی کو نمایاں مقام

ملا۔ سندھی کو اگرچہ ہزاروں سالوں سے عوامی زبان کی حیثیت حاصل تھی اور عربی دور سے تعلیم و تدریس میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت بھی حاصل رہ چکی تھی، لیکن اس کے باوجود چونکہ اسلامی عقائد و علوم کا منبع عربی تھی اور اہل تصوف کے نظریات، فکر اور تعلیمات فارسی کے ذریعے سندھی معاشرے میں پہنچی تھیں اور دلی اور ایران سمیت ممالک میں فارسی دفتری کاروبار چلانے کے لیے استعمال ہورہی تھی اس لیے اس دور میں بھی سندھ کے درباروں میں فارسی کو خاصہ عمل دخل تھا۔ چنانچہ سندھی علماء، فقہاء و مدرس، اہل علم و دانش اور مشاہیر وغیرہ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ ساری اسلامی دنیا میں اہمیت کی حامل عربی اور فارسی میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے، جس کے باعث ایسے ممالک میں بھی ہمارے اہل علم کو شہرت و مقبولیت ملی تھی جہاں صرف عربی اور فارسی پڑھی، پڑھائی، بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

لیکن اب اس لیے صورتحال سندھی کے حق میں زیادہ گئی تھی کہ سومرا حکمرانوں کی اپنی زبان سندھی تھی اس لیے انھوں نے اسے ذریعہ تعلیم بنانے کے علاوہ اس کے علم و ادب کو عام کرنے میں بھی دلچسپی لینا شروع کی۔

سومرا، مسلک کے حوالے سے، اپنے اوائلی دور میں اسماعیلی تھے اور انھوں نے اسماعیلی مبلغین کو ہر ممکن سہولتیں فراہم کیں۔ اسماعیلی فکر کے اولین مبلغ سید نورالدین سندھ آئے۔ انھوں نے اپنی آمد کے بعد اپنی پہچان "سیدالسادات" کے لقب سے کرائی، لیکن اس طرح انھیں عوام سے دوری کا احساس ہوا۔ لہٰذا انھوں نے بعد میں خود کو مقامی رنگت میں ڈھالنے کے لیے اپنا نام "ست گر نور" اور اپنے فکر کی "ست پنتھ" یعنی صراط مستقیم کے نام سے پہچان کرائی۔ (۲۲)

انھوں نے تبلیغی مقاصد کو مؤثر بنانے کی خاطر تبلیغ کو منظوم انداز دیا۔ ایسی بامقصد منظوم تبلیغ کو انھوں نے گنان (گیان) کا نام دیا۔ گنان کی زبان ایک نہیں بلکہ برصغیر میں رائج اور وسیع علاقے میں بولی جانے والی مقبول زبانیں مثلاً سندھی، ہندوی (پنجابی) گجراتی اور سرائیکی کا ملغوبہ تھی۔ فنی اعتبار سے گنان ترجیع بند کی ایک قسم ہے اور بظاہر ایک طرف سندھی اور ہندی کی قدیم شعری صنف "دوھا" معلوم ہوتی ہے، تو دوسری طرف سندھی شاعری کی ایک اور مقبول جنس "وائی" سے بھی ملتی جلتی ہے۔ تاہم گنان، وائی سے عمر میں کافی بڑی ہے اس لحاظ سے گمان غالب ہے کہ "گنان" نے ہی "وائی" کے لیے راہ ہموار کی ہو۔ البتہ سندھی کی ایک مقبول، مشہور و معروف صنف "کافی" نہ صرف گنان کی ہم عصر ہوسکتی ہے، بلکہ شکل و صورت میں بھی دونوں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ "کافی" کے پہلے شعر کو "تھلھ" کہا جاتا ہے اور ہر مصرع کے بعد اسے دہرایا جاتا ہے۔ بالکل اس طرح گنان میں بھی پہلا "ٹیپ کا مصرع" ہر مصرعے کے بعد دہرایا جاتا ہے۔

پیر نورالدین کے بعد پیر شہاب الدین اور پھر ان کے فرزند پیر صدرالدین نے اپنے بزرگوں کی طرح گنان منظوم انداز میں لوگوں کو ازبر کرانے اور غیر مسلم پیروکاروں کو دائرہ دین میں داخل کرنے کا کام جاری رکھا۔ گنان سے مراد ایسے کلام کی لی جاتی ہے، جس میں گیان موجود ہو۔

پیر نورالدین کے گنان کا نمونہ درج ذیل دیا جاتا ہے:

بن کلمے بندگی کرے، تو بندگی سبھی سار، نیوان نت اٹھ راہ چلنا، آخر اجڑواس۔

ترجمہ: بغیر کلمہ پڑھے عبادت بے سود ہے، اے بندے! یہ تمہاری زندگی بھی فانی ہے جس طرح دنیا میں ہر چیز فانی ہے۔ یہ ان بزرگان کی تعلیم، تربیت اور تبلیغ کا ہی کمال

تھا کہ مقامی آبادی (جن میں لوھانہ اور برہمنوں کی تعداد زیادہ تھی) جوق درجوق دائرہ د
میں داخل ہوتی گئی۔ آپ نے انھیں "خواجہ" کا خطاب دیا۔

پیر نورالدین کے بعد پیر شمس (۱۰۶۵ء تا ۱۱۷۶ء) تشریف لائے۔ انھوں
بھی اپنے پیش رو پیروں کا تبلیغی طریقہ اختیار کیا۔ تاہم انھوں نے اپنے طریقہ تبلیغ
"شمس مت" کا نام دیا۔ آپ کے گنان صرف سندھی اور سرائیکی میں ملے ہیں۔ گنان
ضبط تحریر میں لانے کے لیے چالیس حروف پر مشتمل الف ب مرتب کی گئی
"چالیھ اکھری" کہا جاتا ہے۔ بعد میں یہ چالیس اکھری پر مشتمل املا، اسماعیلی مبلغین
پہچان بن گئی۔

اسی عہد میں غوثیہ بزرگوں کو سندھ میں دینی مراکز قائم کرنے کی اجازت ملی
سومرا خود غوث بہاء الدین زکریا کے معتقد بنے۔ (بھاگو بھان نے بھی مذکورہ روایت
تصدیق کی ہے۔)

بعد میں سندھ کی سرزمین پر دین کے دیگر مکاتیب فکر مثلاً قادری، چشت
سہروردی اور نقشبندی مسلک کو بھی دینی مراکز قائم کرنے اور وہاں سندھی کے ذریعے تب
کرنے کی خوب سہولتیں مہیا ہوئیں۔ اس اجازت عام کا اثر یہ ہوا کہ سندھی شعراء کا کا
اور سندھی شعری اصناف سندھ کی حدود سے نکل کر ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں
مسلک بزرگان کے تکیوں، خانقاہوں، عرس، میلے اور درباروں میں گانے کا رواج عام ہو
تحقیق نے بھی ثابت کیا ہے کہ سندھ سے باہر جو "سماع" یا "ذکر" کی محفلیں ہوتی تھیں
وہاں سندھ کی مشہور و معروف شعری اصناف مثلاً دوھڑے، کافی اور بیت وغیرہ بڑی خو
الحانی کے ساتھ گائی اور حضور قلب کے ساتھ سنی جاتی تھیں۔ ایسے ہی اوائل بیت

نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :

کہوا ٹھم، کپڑو سٹیون کین سھے
نظر کریو مھر جی، تن ہین تان مرلھے
اُجاریوس اوھین پرانو پر تو اتھئ (☆)
پوکھیم سرھ تھی پیو جانبھو
اھو اولاں بھوموں کھے آیوتھس جو (☆☆)

وسیں تان ڈس، عالم اتھئ آسرے،
ھانے کیم ترس، جومدوں موٹی آیوں (☆☆☆)

(☆) اس بیت کو اردو خط میں لانے کے لیے بعض سندھی حروف میں تبدیلی لانی پڑی ہے۔ بیت کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ سالک اپنے آپ کو ایک گدلے، میلے اور گندگی بھرے کپڑے کی مانند گردانتے ہوئے خالق و مالک سے التجا کرتا ہے کہ کپڑے کی میل اور گدلے پن کو مت دیکھے۔ تو ہی مالک خالق ہے۔ اگر تو نے نظر کرم کی تو اس کی میل اور گندگی نہ صرف دھل جائے گی بلکہ مزید اجلا ہو جائے گا۔

(☆☆) اس بیت کو بھی اردو املا میں لانے کی خاطر بعض سندھی الفاظ میں تبدیلی لانی پڑی ہے۔ بیت کا مطلب سالک کی اپنے مالک کے سامنے بے بسی کا اظہار ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ سالک تو بڑی محنت کر کے گندم کاشت کرتا ہے لیکن اگر اس محنت میں خلوص کی کمی ہوگی، محبت شامل نہیں ہوگی تو فصل جَو کی بن جائے گی۔

(☆☆☆) مجذوبیت کے عالم میں سالک کی اپنے مالک سے حجت کی انتہا ہے۔ مالک سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ "پورا عالم تیری رحمتوں کے لیے بے تاب ہے۔ اگر رحمت عطا کرنی ہے تو پھر انتظار کیوں کروا رہے ہو۔" حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیں حدیقۃ الاولیاء، تصحیح و حواشی پیر حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۷ء مطبوعہ سندھی ادب جی مختصر تاریخ، مصنف ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، حیدر آباد سندھ، ۱۹۷۳ء ص ۲۲۔

مؤرخ ضیاء برنی نے تو اس وقت کے سندھی شعر کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگانے کا مشورہ دیا ہے کہ ''سندھ میں حضرت غوث بہاؤالدین زکریا کا اس قدر اثر تھا کہ بابا فرد گنج شکر اس علاقے کو غوث کا علاقہ کہا کرتے تھے۔'' (۲۳) حضرت غوث کے پوتے حضرت رکن عالم کے پاس بھی محافل سماع اور محافل ذکر ہوا کرتی تھیں۔ جہاں حسن سندھی نام کا قوال آتا تھا جس کی بڑی شہرت تھی۔ یہ قوال فارسی میں مولانا جلال الدین رومی، حافظ شیرازی اور دیگر ممتاز ایرانی شعراء کا روحانیت اور الٰہیات کی رموز سے مُر کلام کے ساتھ ساتھ جب سندھی شاعری گاتا تھا تو نہ صرف محفل جھوم اٹھتی تی بلکہ اس پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ (۲۴)

تاریخ میں اس بات کا بھی حوالہ ملتا ہے کہ شیخ فرید گنج شکر (۱۱۷۳ء تا ۱۲۷۵ء کی تعلیمات اور طریقۂ تعلیم کو سندھ میں بھی بڑی پذیرائی حاصل تھی۔ آپ کی خانقاہ پر سماع کی جو محفلیں ہوتی تھیں، ان میں اکثر سندھی بیت، کافیاں اور دوھڑے پڑھے، گائے اور بڑے شوق سے سنے اور سمجھے جاتے تھے۔ یہ بھی حوالہ ملا ہے کہ دلی میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس فرید گنج شکر کا ایک مرید و معتقد قوال آتا تھا جس کا تعلق سندھ سے تھا اور اپنے نام کے ساتھ سندھی شامل کرنے پر فخر محسوس کرتا تھا۔ اس قوال کا نام حسین سندھی تھا۔ جب وہ موسیقی کی سنگت میں قوالی کرتا تھا تو بے شمار بیت پڑھتا جاتا تھا۔ ایسی شاعری میں فارسی اور سندھی بھی شامل ہوتی تھی جسے سن کر حضرت شیخ سمیت پوری محفل پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ (۲۵)

سندھی ثقافت اور روایات کی پہچان گیچ بھی اوائلی سندھی شاعری کی ایک مقبول صنف ہے (۲۶) جو کہ سومرا دور میں بھی نمایاں تھی۔ گیچ، خوشی اور مسرت کے اظہار کی

حامل شاعری شمار ہوتی ہے۔ شادی بیاہ یا کسی خوشی کے موقع ور گائی جانے والی، فطری سادگی کی یہ صنف، بے ساختہ اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں سموئے جانے والے الفاظ ترنم سے بھرے تاثر اور مٹھاس کا مرقع ہوتے ہیں۔ سہرو اور لاڈو اس صنف کی قسمیں ہیں۔ مفہوم اور اظہار کے لحاظ سے ہر صنف کا الگ مقام اور اہمیت ہے۔ ایسے ہی ایک گیچ کا نمونہ درج ذیل دیا جاتا ہے۔ جس کا زمانہ بھی وہی سومرا حکمرانی کا ہے۔

اس زمانے میں گیچوں کی تخلیق میں پراوزخیال، ترتیب اور تشبیہہ یا ادائیگی اور معنیٰ و مفہوم کی بندش کے اعتبار سے مائی مرکھاں شیخ نامی شاعرہ کو کافی شہرت حاصل تھی۔ یہ گیچ بھی انہی کا ہے۔

نمونہ : ھی کانڈیرڑی لس، آؤں کھلندی پجندی اچاں قرھیکل ڈٹھو کھم سکھ پار میں،
آؤں کھلندی پجندی اچاں، بھانڈاری ڈٹھو کھم سکھ پار میں آؤں..........

ھئَ واسرڑی وس، آؤں ....

ترجمہ : یہ جھاڑیوں کے جھنڈ اور یہ برسات کی جھڑی میں خوشیوں میں ناچتی آؤں۔ میں نے پیر قرھل کو جنت میں بیٹھے دیکھا ہے۔ میں نے مرشد بھانڈاری کو جنت میں دیکھا ہے۔ سکھیو آؤ گائیں یہ جھاڑیوں کے جھنڈ اور برسات کی جھڑی......(۲۷)

سومرا دور میں ادب کی ایک مشکل لیکن اہم صنف "ہجو" بھی نظر آتی ہے۔ اسے سندھی میں "کیرت" کہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کیرت یا "ہجو" خود سومرا حاکموں کے بارے میں کسی بھان یا چارن کی موجود ہے۔ اس کیرت میں جب شاعر کو رات کے وقت سومرا حکمرانوں کی گلیوں اور گھروں میں روشنی، صحن میں جلنے والے الاؤ اور اس الاؤ سے اٹھنے والا دھواں (جوکہ بستی میں زندگی اور مویشیوں کی موجودگی، خوشحالی کی علامت ہوتے ہیں)

نظر نہ آئے تو یہ ہجو کہنے پر مجبور ہو گیا کہ

سارا پھسے سومرا، آدھا پھسے باقی لوک

مدھم جلے جھوک میں، ورنہ لیٹر پیائی لاٹوں کرے۔ (۲۸)

ترجمہ : سومرا دور کیا ہوا گھروں میں الاؤ کی روشنی اور مویشیوں کو مچھروں سے بچانے کے لیے ہونے والی دھوئیاں بھی مٹ گئی ہیں۔ یہ تو زندگی اور خوشحالی کی علامات ہوتی ہیں۔ اس کو کوتاہی یا کنجوسی پر عوام کی آدھی مذمت جبکہ سومرا جو کہ حاکم ہیں ان کے محلوں میں بھی الاؤ نہ جلنے کی وجہ سے مکمل مذمت کرنی چاہیے کیونکہ یہ تو کوتاہی اور کنجوسی کی انتہا ہو گئی ہے۔

اس دور کے ادبی ارتقاء پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں دعا یا بددعا بھی منظوم کی جاتی تھی۔ بددعائیں جنھیں "پٹ اور پاراتا" کہا جاتا ہے ان کا رواج بھی عام تھا۔ ایسا ہی ایک منظوم پاراتا اردو املا میں محققین کو بہاولپور کے علاقے سے ایک روایت کے روپ میں ملا ہے۔ (☆) پس منظر یوں ہے کہ آخری سومرا حاکم ہمیر سومرا کی حکمرانی میں موجودہ رحیم یار خان (پنجاب) کے علاقے پُھل وڈا کے حاکم جام لاکھے نے ایک چارن کو اعلیٰ نسل کے گھوڑے تحفتاً دیے جنھیں ڈھورے رائے سومرے کی سازش سے چوری

(☆) مذکورہ روایت پنجاب ریاست گزیٹر سلسلہ نمبر xxxvi میں موجود ہے جس کی اشاعت لاہور میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ یہ روایت بعد میں بہاولپور سے نکلنے والے اردو رسالے "العزیز" نے اپنی فروری ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں "پتن منارا" کے عنوان سے شائع کی۔ فی الوقت یہ ساری تفصیل بلوچ، ڈاکٹر نبی بخش کی کتاب سندھی زبان ئیں ادب جی مختصر تاریخ - ایضاً کے ص ۱۳۹ پر موجود ہے۔

کروایا گیا۔ چارن اور تو کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ البتہ اس نے منظوم بددعا دی جسے اردو املا میں اس طرح لکھا گیا ہے:

دھرمی ڈھورا رائے، جنھیں چارن سانکھیاہ،
پتن پیچو تھیو، سیج دٹایو ساہ،
ھمیر اپورا، راج نہ کندا سومرہ

ترجمہ: ڈھورا رائے سومرہ (جس نے چارن کے گھوڑے چرائے تھے) پر لعنت ہو، "پتن" تباہ (☆☆) ویران ہو جائے اور سیج (دریائے ہاکڑا) اپنا رخ بدل جائے اور خدا کرے ہمیر سومرا کی حکمرانی ختم ہو جائے۔

سندھی ادب کی جدید اور قدیم دونوں ادوار کی شعری اصناف میں "بیت" کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ غرضیکہ، بیت، اگرچہ اوائلی شکل میں محدود مصرعوں کی پابندی کا قائل تھا، لیکن اس وقت ایسی کوئی حد مقرر نہیں ہے کہ مصرعوں کی تعداد کتنی ہونی چاہئے اور کتنی نہیں ہونی چاہئے۔ چونکہ عربی میں ایک شعری صنف کا نام بھی "بیت" ہے اور پہلے یہ بھی سندھی بیت کی طرح دو مصرعوں کی پابند تھی اس لیے بعض محققین نے اس گمان کا

(☆☆) پتن منارا شہر کے کھنڈرات رحیم یار خان (پنجاب پاکستان) سے کوئی ۵-۶ میل مشرق میں موجود ہیں۔ ان کھنڈرات کی بہاولپور ریاست کے پولیٹیکل ایجنٹ کرنل منچن نے ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۵ء میں کھدائی کرائی تھی۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ "ان کھنڈرات میں ایک منارا موجود تھا، جسے پلستر کیا گیا تھا۔ جب اس کا یہ پلستر اتارا گیا تو اس پر سندھی صور تختی میں ایک عبارت موجود تھی۔ مزید معلومات یہ ملی ہے کہ پتن منارا سومرا دور میں مرکزی شہر تھا اور سومرا حکمرانوں نے اسے نئے سرے سے تعمیر کرلیا تھا۔

اظہار کیا کہ سندھی بیت دراصل عربی بیت کی ہی ایک صورت ہے۔ لیکن نئی تحقیق نے یہ ابہام دور کر دیا اور یہ راز افشاں کر دیا کہ "جب عرب سندھ میں آئے تو ان سے کافی عرصہ پہلے ہی سندھی شعراء بیت کی شاعری کرتے تھے۔ تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ عربی ادب سے تعلق رکھنے کے بعد سندھ کے بعض کلاسیکل شعراء نے سندھی بیت کو عربی تشبیہات، استعاروں اور دیگر خوبیوں سے آراستہ کیا ہو۔ (یا عربی ادب نے سندھی ادب کا رنگ لے لیا ہو) نہ صرف ساخت، ترتیب و ترکیب کے اعتبار سے بلکہ ہیئت کے لحاظ سے بھی بیت کی صنف، اتنی طویل مدت سے سندھ میں رائج رہی ہے کہ اس کی مختلف صورتیں بھی بن گئی ہیں۔ اس کی ایک شاخ طویل (ڈگھو) بیت ہے۔ یہ لامحدود مصرعوں کی ایسی ہی شاعری ہے جس طرح عربی اور فارسی میں "مثنوی" کی صنف ہے۔

دوسری شاخ کو واقعاتی بیت کہا جاتا ہے۔ دراصل پہلی صورت کے بیت میں روحانی رموز اور دینی موضوعات سموئے جاتے ہیں جبکہ ثانیا صنف کو مختلف واقعات سمونے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ کئی تاریخی اور نیم تاریخی واقعات کے علاوہ ملکی اور معاشرتی واقعات اور حادثات کو بھی زیر تذکرہ شاعری میں بڑی آسانی سے سمویا جاتا ہے۔ اس وقت کئی واقعاتی بیت، ادبی تاریخ میں حوالے کے طور پر جگہ لے چکے ہیں۔ تاہم بیت کی تیسری شاخ "نزہیت" بھی ہے۔

سومرا حکمرانوں کے آخری ایام ۱۳۳۰ء کے دوران خلجیوں کے سندھ پر پے در پے حملوں اور اندرونی انتشار کی وجہ سے سومرا حکومت برقرار رہ نہ سکی اور سندھ خلجیوں کے قبضے میں آگیا۔ تاہم صرف تین سال مشترکہ کوشش کر کے اہل سندھ نے خلجیوں سے اپنی حکومت واپس لے لی۔ البتہ اتنی تبدیلی ضرور آئی کہ اس مرتبہ سندھ کا حکمران سومرا

خاندان کی بجائے ایک اور سندھی قبیلہ سمہ بنا۔

سومرا دور کے ادب کا تجزیہ کرنے سے درج ذیل اہم نکات سامنے آتے ہیں :

۱- عشقیہ اور نیم عشقیہ، تاریخی و نیم تاریخی داستانیں تخلیق کرنے، سننے اور سنانے کا رواج عام ہوا۔ جسے ایک طرف لوگوں میں اپنے سورماؤں، سرفروشوں اور نامور لوگوں کے کارناموں، کارہائے نمایاں، کامیابیوں اور ناکامیوں، نیک نامیوں اور غلطیوں کا تجزیہ کرنے کا شعور بڑھا تو دوسری طرف تاریخی حالات پر نظر رکھی اور دلچسپی لی جانے لگی۔

۲- داستانوں کو موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ریت پڑی جس سے داستانوں کے درمیان داستانوں کے اہم حصوں کو اختصار سے موسیقی کے مطابق منظوم کرنے کی رسم کو فروغ ملا اور گاتھا کی نئی شاعری عام ہوئی۔

۳- سندھی اگرچہ مدرسوں، مکتبوں، تبلیغی اور تعلیمی مرکزوں کی کامیابی کی ضمانت بن چکی تھی، لیکن اب دانش گاہوں اور درسگاہوں میں تصنیف و تالیف میں عربی کے ہمرکاب رہنے کی جو اس کی حیثیت تھی اس میں مزید پختگی پیدا ہوئی اور سومرا دور کی مذہبی تحاریک کی کامیابی کا وسیلہ بھی بنی۔ اس کے نتیجے میں مذہب و اخلاقیات و معاشرتی اصلاحات کے متعلق ہر قسم کی عبارت آرائی کے لیے اسے موزوں و مناسب بنایا گیا۔

۴- اس دور کی سندھی شاعری کے لیے چھند دویا کے پیمانے اختیار ہوئے جو کہ موسیقی کے لیے بھی مقرر تھے۔ چنانچہ شاعری اور موسیقی لازم و ملزوم بن گئی۔

۵- اس دور کی سندھی شاعری میں ہر قسم کے مذہبی، معاشی اور معاشرتی مسائل اور

موضوعات سمونے کے ساتھ ساتھ تصوف اور فلسفیانہ مضمون شامل کرنے کی بھی وسعت پیدا ہوچکی تھی جس کے باعث سندھی شاعری انفرادی مجلسوں اور محفلوں سے نکل کر پیروں، درویشوں، صاحب عرفان اور اہل تصوف کے تکیوں، خانقاہوں اور درباروں پر ہونے والی سماع اور ذکر و فکر کی یاد الٰہی والی محفلوں میں پہنچی۔

۶- سومرا دور میں ہی رزم گوئی رزمیہ شاعری کی مقبولیت اور مشہوری میں اضافہ ہوا۔

۷- اسی زمانے میں سماجی سطح پر مسرت و شادمانی کے موقعوں پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے گیچ کی شاعری کو نہ صرف رواج ملا بلکہ اس کی مقبولیت میں وسعت بھی آئی۔

۸- ہجونگاری جسے سندھی میں کیرت بھی کہا جاتا ہے، اس کا ادبی سطح پر رواج ہوا۔

۹- منظوم پیش گوئی بھی اسی عہد میں شروع ہوئی اور مستقبل کے سندھی ادب کی پختہ عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ (۲۹)

۱۰- سومرا عہد میں ہی قومی امنگوں اور جذبات کی عکاسی کا حامل ادب وجود میں آیا۔ ایسی شاعری میں وطن، وطنیت، لوگوں، مٹی، ندی، پہاڑ اور حب وطن کے دیگر موضوعات نہ صرف منظوم ہوئے بلکہ ایسی شاعری سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور عوامی پسند بنی۔ انہی خصوصیات اور خوبیوں کو لے کر سندھی ادب آنے والے دور میں داخل ہوا۔ آنے والے دور کو تاریخ مین سمہ دور کہا جاتا ہے جوکہ ۱۳۵۰ء سے شروع ہوکر ۱۵۰۱ء میں آکر اختتام کو پہنچتا ہے۔ سمہ حکمرانوں نے اپنے لیے "جام" کا لقب اختیار کیا اور ٹھٹھہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ ایک سال بعد دلی کے بادشاہ

محمد بن تغلق نے مارچ ۱۳۵۲ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ اگرچہ بادشاہ خود بیمار ہوکر فوت ہوگیا جس کا ٹھٹہ کے قریب ہی مزار بنایا گیا، لیکن سندھ کو کچھ عرصے کے لیے دلی کی سلطنت کا حصہ بنادیا گیا۔

سمہ خاندان نے عوام میں اتحاد و اتفاق کی قوت پیدا کی اور اس قوت کو، سندھ کی دلی سے آزادی کے لیے کامیابی سے استعمال کیا۔ اس خاندان میں جام نظام الدین خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اسے لوگ حکام نہیں بلکہ اپنا ساتھی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے عوامی نام "جام نندہ" سے پکارا جاتا تھا، "جام نندہ" نے سندھ پر مسلسل ۴۸ سال حکمرانی کی جو کہ ان کی مقبولیت و ہردلعزیزی کا ثبوت ہے۔ آپ کا مقبرہ ٹھٹہ کے قریب واقع مشہور تاریخی قبرستان "مکلی" میں موجود ہے اور سندھی فن تعمیر کی اعلیٰ مثال ہے۔

ان کے بعد بھی تقریباً گیارہ سال سندھ پر سمہ راج رہا لیکن مذکورہ عرصہ اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باعث سندھ میں انتشار اور افراتفری کو فروغ ملتا رہا جس نے ملکی حالات کو کمزور بنادیا۔ نتیجتاً بابر بادشاہ نے جس ارغون خاندان کو قندھار سے نکال دیا تھا، اس خاندان کے ایک فرد شاہ بیگ ارغون کو شہ ملی اور اس نے سندھ پر حملہ کرکے سندھ کی گادی ٹھٹہ پر قبضہ کرلیا۔

ان مسلسل حملوں، سازشوں اور افراتفری نے جس بے یقینی کی فضا کو فروغ دیا، سیاسی صورتحال کو کمزور کیا، اقتصادی اور معاشرتی ماحول کو طبقات میں تقسیم کیا اور مذہبی طبقے نے لالچ، حرص و ہوس اور اقتدار کی خاطر مذہب کو تجارت میں تبدیل کیا، اس سے سندھی ادب کو ایک نیا رخ ملا۔ نئے نئے موضوعات کو سمویا جانے لگا اور مذہبی طبقے کی مصلحت کوشی کو مذمتی انداز میں پیش کیا گیا۔ مظلوم کو حق سچ کہنے کی جرأت پیدا ہوئی،

عارف اور اہل اللہ نے اللہ کے درالتجائی انداز میں ظلم و جبر کا دور کم کرنے لیے شاعری کی "پیشن گوئی" کرنے کی رواج بڑھا، مذہبی طبقے کی طرف سے مراعات کے حصول میں دلچسپی لینے کے باعث تصوف کو عوامی اتحاد و اتفاق کا ذریعہ اور عظمت انسانی کی قدر شناسی کا وسیلہ بنانے پر زیادہ توجہ دی گئی۔

عالمی شہرت یافتہ جرمن سکالر، ڈاکٹر این میری شمل نے اعتراف کیا ہے کہ "سندھی زبان کی ادبی حیثیت کو فروغ دینے میں سندھ کے اہل تصوف کا بہت بڑا حصہ ہے۔" نیز، انھوں نے لکھا ہے کہ "ٹھٹہ (جسے ٹھٹہ نگر بھی کہا جاتا تھا) کو ارغون دور میں بھی تصوف اور ثقافت کی توسیع کرنے میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔"

ٹھٹہ شہر کے نزدیک ایک شہرت یافتہ تاریخی قبرستان موجود ہے جسے مکلی (Makli) کا قبرستان کہا جاتا ہے۔ اس قبرستان میں ایک اہل اللہ شیخ حماد جمالی کا مزار واقع ہے۔ سمہ حاکم جام تماچی خود بھی اس شیخ کے معتقدین میں شامل تھے، لیکن جام جونہ ہوس اقتدار کی خاطر دلی میں سلطان فیروز شاہ سے سازباز کرکے ایک سازش کے تحت جام تماچی اور اس کے فرزند جام صلاح الدین کو دلی بھیجا جہاں انھیں نظر بند کردیا گیا۔ یہ کافی طویل نظربندی ثابت ہوئی اور جام جونہ علاؤ الدین کے لقب سے خود سندھ کا حکمران بن بیٹھا۔

جام تماچی کی والدہ شیخ حماد جمالی کے پاس، جام تماچی اور اس کے فرزند جام صلاح الدین کے حق میں دعا کرانے کی خاطر پہنچی۔ کئی دنوں تک درویش کے پاس سائل بنی رہی اور اس مسجد میں جھاڑو اور صفائی کرتی رہی جہاں درویش نماز پڑھنے اور عبادت کرنے آیا کرتا تھا۔ آخرکار ایک دن شیخ حماد جمالی نے جام تماچی کے حق میں ایک جامع دعا کی۔ یہ دعا سندھی شعری صنف بیت کا ایک اعلیٰ نمونہ گردانی جاتی ہے۔ دعا کا ترجمہ ذیل میں دیا

جاتا ہے :

Junah "جونہ عقل کا اندھا تھا، آؤ جام تماچی تم آؤ۔ کریم نے اپنا کرم کردیا ہے۔ تمہیں رہائی مل گئی ہے اب آؤ ٹھٹہ کے حاکم ہو۔"

ایک اور کامل انسان نوح ہوتھیانی نے بھی منظوم اشعار میں جام تماچی کی رہائی اور سندھ کے تخت پر بٹھانے کی بشارت دی جس کا تاریخ میں ذکر ملتا ہے :

سندھ میں بھٹ شاہ سے حیدرآباد سندھ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں "کھیر" کا قصبہ آتا ہے۔ کھیر سے ملحقہ نوح ہوتھیانی نامی درویش کا مقبرہ ہے۔ ایک بیت میں نوح درویش نے لوگوں کو جام تماچی کے رہا ہونے کی بشارت دیتے ہوئے کہا تھا کہ "لوگو جاؤ، جام جونہ کا کام ختم ہوا۔ اسے تخت سے اتارکر جام تماچی کے شادیانے بجاؤ اور اسے بادشاہ بنادو۔" ایک روایت کے مطابق ایک بیت خود بھی گنگناتے تھے، جس کا اردو ترجمہ کچھ یوں ہے : "تین روز سے جام تماچی کی نوبت باج رہی ہے، وہ آرہا ہے، درخت پودے، چرند پرند خوش ہیں کہ تماچی آرہا ہے۔" (۳۰)

اس عہد کے اسحاق آہنگر بھی تھے۔ جن کا ذکر سندھ کے اہل اللہ اور کامل انسانوں کے علاوہ ان کتابوں میں بھی ملتا ہے، جو سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی گئیں اور مشاہیر سندھ کی سوانح حیات (HAGIOGRAPHY) کا اہم ذریعہ ہے۔ آہنگر مرحوم بھی بیت کے شاعر تھے اور آپ سے منسوب ابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے دور کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی انتشار اور گھٹن فضا سے بہت نالاں و ناراض رہتے تھے۔

آہنگر مرحوم کے ہم عصر شعرا میں "ستیو" نامی "ول" وفات (۱۵۶۹ء) ذات کے درویش بھی شامل تھے۔ اگرچہ "ستیو" مرحوم مجذوبی حالت میں ہمیشہ سیر و تفریح میں

مصروف رہتے تھے اور بظاہر وہ دنیا وما فیہا سے بے فکر و بے نیاز نظر آتے تھے لیکن کبھی کبھی بیت کی شکل میں پیشن گوئی کر جاتے تھے۔ آپ کی پیشن گوئیاں حقیقت کے روپ میں ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ (۳۱)

اسماعیلی مبلغین جن کی سومرا دور حکومت کے آغاز میں سندھ میں آمد ہوئی، وہ اوائلی ایام میں سندھی، سرائیکی، ہندی اور ہندوی (پنجابی) زبانوں کا ملغوبہ بنا کر گنان کی شاعری کے ذریعے تبلیغ میں مصروف رہتے تھے۔ ان مبلغین میں پیر صدرالدین بھی تھے۔ آپ کے، پیر حسن کبیرالدین اور پیر تاج الدین نامی دو فرزند تھے، جن میں سے پیر تاج الدین اپنے بزرگوں کی تقلید کرتے ہوئے اسماعیل مکتبہ فکر عام کرنے میں کافی فعال تھے، لیکن آپ خالصتاً سندھی میں تبلیغ کرتے اور سندھی میں ہی بیت تخلیق کرتے تھے۔ آپ کی ایسی ہی شاعری سے ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"معمولی اور بے قیمت چیزوں کے کاروبار میں کوئی منافع نہیں ہوتا۔ ایسی چیزوں کا لینا اور دینا اس کے لیے، دونوں برابر ہیں، جو جوہری جواہرات کی بجائے کانچ خریندے کا بیوپار کر رہا ہے۔ اس سے لین دین ہی نہ کیا جائے۔ جوہری ہو، تو جواہر کی پرکھ رکھنا ضروری ہے۔ جب جواہر خریدنے ہیں تو جواہر کی پرکھ اور پہچان سب سے زیادہ رکھنی چاہیے۔" (۳۲)

اہل سندھ کی چند گمنام فارسی تصانیف میں تصوف کے بڑے انمول اور بے بہا نکات سے بھرپور سندھی شاعری بھی ملتی ہے، جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ، سولھویں صدی عیسوی کے دوران سندھ کی اہل علم نے مزید موتی بھی بکھیرے ہوں گے اور اس طرح کی اعلیٰ خوبیوں سے مُد اور بھی شاعری کی ہوگی لیکن تاریخ کے تیز دھار بہاؤ نے وہ

مواد مورخوں اور محققوں تک پہنچنے سے پہلے ہی کسی بھور کے حوالے کردیا ہوگا۔

اصل میں مذکورہ صدی اور اس کے بعد والی صدی کے دوران، سندھ میں اس قدر انتشار رہا کہ ذی شعور، حساس اور دنیاوی درد رکھنے والے اہل علم و فضیلت کو ترک وطن کرنا پڑا۔ ایسے ہی سندھ کے اہل تصوف کو ان ایام میں اپنا وطن چھوڑ کر وسطی بھارت کے علاقے برہانپور جانا پڑا۔ وہاں جانے اور نئے ماحول کے باوجود انھوں نے سندھی شاعری تخلیق کرنے اور اسے سندھی موسیقی کے آہنگ میں گانے کی روایت جاری رکھی۔ (۳۳) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ زمانے میں ایک اور صنف کافی اور دیگر عارفانہ کلام گانے کا رواج عام تھا اور سماع کی مخصوص محفلوں میں رقص کی ریت بھی زوروں پر تھی۔

تصوف کی مہدوی تحریک بھی ان ہی ایام میں سندھی میں پہنچی اور قاضی قاضی کی ایک مؤثر و معتبر علی شخصیت مذکورہ تحریک لے پیروکاروں میں شامل ہوئی۔ قاضی قاضن (وفات ۱۵۵۱ء) ولد قاضی ابو سعید لن زین الدین کا تعلق بھی اسی ضلع دادو میں قلندر کی نگری سیوہن سے تھا۔ جس کے ساتھ شیخ مبارک کے دونوں بیٹوں ملا فیضی اور آئین اکبری کے مصنف ابوالفضل کا تعلق تھا۔ اکبری دربار کے ان اہم رتنوں کے طفیل ہی مہدوی تحریک کی باتیں اکبر بادشاہ تک پہنچیں۔ (۳۴) تحریک کے بانی جونپور کے محمد مہدی تھے اور اکبری دربار کی حمایت کے باوجود سندھ میں یہ تحریک مؤثر ثابت نہیں ہوئی چہ جائیکہ قاضی قاضن جیسی علمی شخصیت کی اس تحریک میں شمولیت ہوچکی تھی۔

علمیت کے اعتبار سے قاضی قاضن حافظ قرآن، قرأت، تصوف اور علم تجدید کے عالم، ممتاز مفسر اور علم حدیث و فقہ میں یکتا تھے۔ آپ ریاضی کے ماہر ہونے کے علاوہ فارسی میں انشاء پردازی کے تو استاد گردانے جاتے تھے۔ (۳۵) آپ کا ایک شعری ذخیرہ

"قاضی قاضن جو کلام" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، تاہم لوائلی ایام میں دستیاب ہونے والی شاعری سے، کچھ ابیات اب بھی بہت مقبول ہیں۔ ان اشعار کی رو سے شاعر کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ یہ کہ "کنز، قدوری اور کافیہ کا مطالعہ محبوب حق کے تصور کے سامنے ہیچ لگتا ہے۔" اس شعر میں قدوری کی جو بات کی گئی ہے وہ دراصل حنفی فقہ کے متعلق کتاب ہے جسے گیارہویں صدی عیسوی میں تحریر کیا گیا اور بعد ازاں یہ برصغیر کے مکتبوں اور مدرسوں میں لازمی پڑھائی جانے والی تصنیف بن گئی۔

کافیہ بھی اس گرائمر کی کتاب کا نام ہے جس کے مصنف ابن حاجب (وفات ۱۲۴۹ء) تھے۔ یہ نظم میں ہے اور دینی تعلیم کے دوران مذہبی علماء اپنے طلباء کو اس کا حفظ کراتے تھے، کنز بھی ان مستند احادیث کا مجموعہ ہے، کنز الاعمال کے لیے بڑی مفید ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کے وہ اشعار درج ذیل پیش کیے جاتے ہیں، جنھیں اردو املا میں بآسانی لکھا اور پڑھا جاسکتا ہے:

۱۔ آپ کا یہ شعر بہت معنی خیز مانا جاتا ہے:

کری منڈی ماکوڑی کھوہ میں، پچی کچھ اِھ!

ترجمہ: کنز، قدوری اور کافیہ جیسی فقہی مسائل کے حل سے بھرپور کتابیں تو ہر ایک پڑھ لیتا ہے لیکن کوئی بتائے کہ ایک لنگڑی چیونٹی جو کنویں میں گر گئی ہے وہ بھی آسمان کی طرف کیوں متوجہ ہے!

۲۔ آپ کا یہ ایک اور بیت بھی ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے:

کنز، قدوری، کافیہ کی کین پڑھیوم

اھو پارئی بیو، جتان پریں لدھوم

ترجمہ : میں نے کبھی فقہ کی کتابوں سے کنز، قدوری اور کافیہ نہیں پڑھیں پھر بھی ایک اور گوشے میں سے جھانکتے ہوئے اپنے محبوب پر میری نظر پڑ گئی ہے۔

۳- سالک کی کیفیات کا بھرپور عکس پیش کرتے ہوئے یہ شعر تخلیق کیا گیا ہے :

جوگی جاگایوس، ستو ہوس نڈر میں
تہاں پوءِ تھیوس، سندے پریاں پچرے

ترجمہ : میں غفلت کی نیند میں غافل سویا ہوا تھا، جہاں سے مجھے جوگی نے آکر جگایا۔ جاگنے کے بعد چلا ہوں تو اپنے محبوب کے بتائے ہوئے راستے کو پاکر اس پر چلنے لگا ہوں۔

آپ کی دیگر شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ توحید آپ کے تصور اور تخیل کا محور ہے۔ آپ کی شاعری میں گہرائی خیال، تجنیس حرفی کا قابلیت سے استعمال اور ابہام وغیرہ کو موزوں اور مناسب مقام پر شامل کرنے کی خوبی دیکھ کر بے اختیار آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ خوبیاں شعراء کو ایسی پسند آئیں کہ بعد میں آنے والے تصوف کے شعراء یا روائتی شاعری کرنے والے اکثر شعراء نے آپ کی پیروی کی ہے۔

اس عہد کی دیگر سندھی شاعری بھی اگرچہ مذکورہ خصوصیات سے سرشار نظر آتی ہے، لیکن شاعری کے علاوہ دیگر تخلیقی اور تحقیقی ادب مع عربی و فارسی، علمی و قلمی قابلیت کے کمالات دکھانے کا مظاہرہ بھی خوب کیا جاتا رہا ہے۔ سندھی اہل علم و دانش نے ابن العربی کے نظریۂ وحدت الوجود کی تفسیر، تفصیل اور تشریح بھی جس انداز سے کی ہے اس سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ جیسے مذکورہ نظریہ نے جنم ہی سندھ میں لیا ہو۔ وحدت الوجود

کے علاوہ تصوف کی دنیا میں جو بھی مکتب فکر و فلسفے، رتصوف کے نام پر پروان چڑھے ہیں ان سب کی جھلک اس عہد کی تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہے۔

ایک طرف اس خطے کے شعراء اور اہل علم مذکورہ بالا موضوعات سے اپنا علمی ذخیرہ وسیع کررہے تھے، تو دوسری طرف اصلاح اخلاق، تشریح دین، عظمت انسانی، سماجی برائیوں کے خاتمے اور فقہی مسائل کو آسانی سے سمجھانے کے سلسلے میں بھی مدلل ادب تخلیق کررہے تھے۔ اس ضمن میں ضلع دادو کی تحصیل ٹوبک کے عالم مخدوم محمد جعفر کو کافی اہمیت حاصل ہے، جنھوں نے "طلاق" کے موضوع پر سندھی میں عام فہم انداز اختیار کرتے ہوئے کتابچہ تحریر کیا تھا۔

تاریخ میں جہاں مذکورہ بالا عالم کا مستند حوالہ ملتا ہے وہاں، ٹھٹہ کے محمد صالح ولد ملا زکریا کی فارسی کتاب "معارف الانوار" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹہ کے شیرازی سادات میں سے پیر مراد شیرازی اپنے عہد کے اچھے اور اچھوتے شاعر تھے۔ ان کا مختصر مگر پختہ اور انوکھے انداز کا کلام دستیاب ہوا ہے، جسے "الف اشباع" کی شاعری کہا جاتا ہے۔ مذکورہ شعری انداز کو دیکھ کر اور اس میں پختہ طریقے پر مفہوم کی ادائیگی کے حامل الفاظ کی جزاوت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ زیر تذکرہ عہد میں "واؤ" اور "الف اشباع" کی شاعری کا رواج بھی پورے طور پر جڑ پکڑ چکا تھا۔ پیر مراد شیرازی کی ۱۴۸۶ء میں وفات ہوئی۔

الہ آباد کے جمال الدین ابوبکر کی کتاب تذکرہ قطبیہ (تصنیف ۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) ایک ایسی تاریخ کا کام دیتی ہے، جس سے ایک طرف سندھی اہل اللہ اور درویشوں کی زندگی کے بارے میں مکمل سوانح کی معلومات ملتی ہے تو دوسری طرف سندھ سے باہر سندھی

ادب اور اس کی ترقی کے لیے ہونے والی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ پر ضلع رحیم یار خان (پنجاب) کے قدیم شہر "موئے مبارک" کے اہل اللہ شیخ عبدالجلیل کی سوانح، ملفوظات اور سندھی شاعری کا نہ صرف ذکر ملتا ہے بلکہ ابیات کے علاوہ ایسا مواد بھی ملتا ہے جس سے اس علاقے میں سندھی زبان و ادب کے فروغ کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ "ایک رات حضرت شیخ برادری کے قریشیوں نے آپ کو قتل کرنے کی کوشش میں ایک میراثی کو ماردیا۔ اس واقعہ کو حضرت شیخ نے سندھی بیت میں منظوم کیا ہے۔ بیت یہ ہے:

"لگی لچ قریشیاں، مارے ڈوم فقیر" (ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں)

ایک اور بیت بھی حضرت شیخ سے منسوب ہے جوکہ اس طرح ہے:

(حضرت) "محمد ﷺ ہردم رھیو تن ماں،

ھُو تاھِن، ھوں ناھن، ھَن ری ھی ناھیں" (۳۶)

ترجمہ: (میرے من میں حضرت محمد ﷺ ہر دم رہتے ہیں۔ آپ کی یاد کے بغیر میرا کوئی دم نہیں اور ان کی موجودگی کے بغیر میں رہ نہیں سکتا ہوں)

حضرت شیخ کو روحانی رموز میں اعلیٰ مقام اور فیاضی "فیض کے باعث" قطب العالم کا لقب حاصل تھا لیکن عوام آپ کو "شیخ چوھڑ" کے مانوس نام سے جانتے تھے۔ شجرے کے اعتبار سے آپ کو حضرت غوث بہاؤ الدین زکریا ملتانی سے رشتے کی نسبت حاصل تھی۔ آپ کی جس محفل میں بھی موجودگی ہوتی اور ذکر و فکر یا سماع کی جو بھی محفل منعقد ہوتی، وہاں سندھ کے خوش الحان قوال (ذاکر) سندھی اور فارسی کلام گاکر آپ سمیت تمام لوگوں پر وجد طاری کردیتے۔ (۳۷)

روحانیت کی حامل سماع کی محافل کے ذریعے عارفانہ سندھی اور فارسی کلام سننے اور سنانے کا رواج بعد میں حضرت رکن الدین کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ ان قوالوں کو محفل و مجلس کی رونق گردانہ جاتا تھا، جنھیں محفل دیکھ کر اشعار کا انتخاب اور ادائیگی پر پورا پورا عبور ہو اور جس کی وجہ سے پوری محفل یاد الٰہی میں مدہوش کرنا جانتے ہوں۔ سندھی قوالوں کی یہ شہرت ملتان کے علاوہ پنجاب، کانگڑہ، کوہستان اور دلی تک پہنچی ہوئی تھی اور یہ لوگ اکثر ان محافل و مجالس میں جاکر سندھی شاعری اور شعراء کی نمائندگی کرکے داد تحسین حاصل کرتے تھے۔

اگرچہ ان محافل میں پڑھی جانے والی شاعری عارفانہ اور تصوفانہ موضوعات پر مشتمل تھی لیکن سندھ میں ان موضوعات سے ہٹ کر پیش گوئی پر مشتمل مواد دکھائی دیتا ہے۔

شکارپور سندھ کے فقیر محمد "طالب" (۱۴۶۰ء تا ۱۵۲۰ء) بھی زیر تذکرہ زمانے کے شاعر گذرے ہیں۔ "طالب" مرہوم ذات کے سومرا تھے اور آبائی گاؤں (تھر کا علاقہ) عمر کوٹ تھا۔ جہاں سے تحصیل "لکھی" کے قصبے "مزار" میں آکر سکونت اختیار کی۔ (☆) آپ کا دستیاب ہونے والا کلام موضوع کے اعتبار سے پیش گوئی ہے، فنی لحاظ سے بیت کی فہرست میں آتا ہے اور شعری صنف کے مطابق اس کلام کو طویل بیت کہا جائے گا۔ آپ کا کلام محدود مصرعوں کے حامل بیت کے زمرہ میں آتا ہے۔

(جاری ہے)

(☆) مزار نامی قصبے کی سمہ جام مزار نے ۱۴۳۵ء میں تعمیر کروائی تھی۔